حسینؑ اور اسلام

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

حسینؑ تاریخی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں ، ان کی شخصیت اور عظیم کارنامے کروڑوں افراد کے سرعقیدت کو خم کئے ہوئے ہیں ۔تم نے ممکن ہے کہ ان کے عظیم کارنامۂ زندگی کے مطالعہ اور ان کے حیرت انگیز ثبات قدم اور استقلال وتدبر سے بھرے ہوئے بے مثال اقدام اور قربانی کے حالات پر اطلاع حاصل کرنے کا موقع نہ پایا ہو،لیکن کم سے کم تم نے حسینؑ کا نام ضرور سنا ہوگا اور اتنا جانتے ہوگے کہ وہ کسی بڑے تاریخی واقعہ کے ہیرو ہیں۔ممکن ہے یہ خیال بھی تمہارے دل میں کبھی آتا ہو کہ یہ حسینؑ کون تھے اور آخر اس واقعہ کے خصوصیات کیا ہیں جو اس بڑے انسان کی ذات سے تعلق رکھتا ہے ۔ اچھا تو پھر آؤ۔صبر وسکون کے چند لمحے مجھ کو رعایت دو۔

میں تم کو حسینؑ اور ان کے مشن سے جس کے سلسلہ میں انہوں نے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے میں دریغ نہیں کیا مختصر لفظوں میں شناسا کراؤں جس سے تم کو حسینؑ اور ان کے اقدامات کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کا موقع مل سکے۔

حسینؑ کون تھے؟

حسینؑ کے ساتھ اسلام کا روحانی تعلق

چھٹی صدی عیسوی میں جبکہ دنیا تاریکی کے عظیم دور سے گزر رہی تھی اور انسانی تمدن کی کشتی تفرقہ اور فساد کے طوفان سے ڈانواڈول تھی جزیرہ نمائے عرب سے اسلام کا آفتاب طالع ہوا جس کی ابتدائی کرنیں اگرچہ حجاز کے مرکزی مقام مکہ معظّمہ سے ظاہر ہوئی تھیں لیکن رفتہ رفتہ اس کی روشنی شرق وغرب عالم پر چھا گئی اور دنیا کو روشن کردیا۔

یہ ہردلعزیز اور عالمگیر مذہب جس کا نام ہے اسلام اپنے ابتدائی دور میں ترقی واشاعت کی حیثیت سے دو عظیم شخصیتوں کی جانفشانی اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا۔ایک پیغمبر اسلام محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، دوسرے ان کے چچازاد بھائی علیؑ بن ابی طالب۔

اگرچہ دوسرے بہت سے صحابہ کرام نے جو خدمات انجام دی ہیں اور جاں نثاری اور فداکاری کے فرض کو انجام دیا ہے ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور وہ تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہیں لیکن ان کو اسلام کے سنگ بنیاد نصب ہونے اور اس کے بعد والے ابتدائی مراحل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس کے بعد انہیں اساسی حیثیت دی جاسکتی ہے بلکہ وہ ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً انہی دو بزرگوں کے ثبات قدم اور حیرت ناک استقلال اور اپنے خون کو پسینہ سمجھ لینے کا اثر تھا کہ اسلام کی بنیادیں قائم ہوئیں اور حیرت ناک تیزی کے ساتھ اس کی اشاعت ہوئی۔

قدرت کو ان دونوں بھائیوں کے اتحاد کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا تھا۔ حضرت رسول اکرمؐ کی اکلوتی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے ساتھ حضرت علیؑ بن ابی طالب کا عقد ہوا اور اس طرح علیؑ کو بھائی ہونے کے علاوہ ایک قسم کی فرزندی بھی رسولؐ سے حاصل ہوگئی اور یہ دونوں سلسلے جو کہ اشاعت اسلام میں متحد تھے اور زیادہ استحکام کے ساتھ ایک نقطہ پر جمع ہوگئے۔

انہی ماں باپ حضرت فاطمہؑ اور علی بن ابی طالبؑ سے دو بچے متولد ہوئے جن کا نام تھا حسنؑ اور حسینؑ ، اور عین اس وقت کہ جب اسلام ایک نوعمر بچہ کی حیثیت سے رسول اسلامؐ کی

آغوش میں پرورش پارہا تھا ان دونوں بچوں کی ولادت ہوئی جن کی پرورش بھی رسولؐ کی آغوش میں شروع ہوئی اور اسطرح ان دونوں کا اور اسلام کا گہوارۂ تربیت ایک قرار پایا، ایک طرف نانا کہ جو بانیِ اسلام تھے اور دوسری طرف باپ کی جو مجاہد و محامی اسلام تھے ان کے خدمات اور کارگزاریاں سامنے تھیں اور اس ماحول کے باعث اسلام کے ساتھ روحانی تعلق اور دلی ارتباط ان دونوں بچوں میں بچپنے ہی سے راسخ ہو گیا اور جتنی عمر بڑھتی گئی الفت اسلام کا جذبہ مستحکم تر ہوتا گیا۔

مذہبی عقائد سے جن کی بناء پر یہ دونوں بزرگ (حسنؑ وحسینؑ) امام خلق وحقیقی ذمہ دار اسلام قرار پاتے ہیں بالکل الگ ہو کر تاریخی اعتبار سے بھی یہ ایک مسلمہ حقیقیت ہے کہ ان دونوں بزرگوں کی زندگی پابندیِ شریعت اور حفظانِ اصول مذہب کی حیثیت سے اسلامی تعلیمات کا مکمل آئینہ اور احکام شریعت کا مجسم نمونہ تھی اور اس لئے بھی اسلام اور شریعت اسلام کے ساتھ جتنی گہری ہمدردی ان کو ہو سکتی تھی کسی کو نہیں۔

بنی امیہ کا دور حکومت یا تاریخ کا ایک سیاہ ورق

پیغمبرؐ اسلام کی وفات اسلام کے لئے ایک سخت ترین مصیبت تھی جس کے بعد ہی سے اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ شروع شروع میں کچھ عرصہ تک اس کی سادگی اور حقیقت پروری، ظاہری جاہ وعزت سے بے تعلقی اور مادی ساز وسامان سے کنارہ کشی ایک حد تک محفوظ تھی لیکن ادھر فتوحات نے ترقی کی، قیصر وکسریٰ کے ممالک پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا، شاہانہ تزک واحتشام اور سلطنتی جاہ وجلال سے آنکھیں دوچار ہوئیں۔ ادھر اسلامی افراد میں بھی کشور آرائی اور جہاں بانی کے جذبات نے پرورش پائی اور مذہبی پابندیوں کے بجائے سیاسی منصوبہ بازیوں اور کمزوروں کے مقابلہ میں جابرانہ طاقتوں کے مظاہرہ کا دور دورہ ہو گیا۔

رسولؐ اور ان کے خاندان (بنی ہاشم) کے قدیمی حریف بنی امیہ کو جو برابر رسولؐ سے اشاعت اسلام کے خلاف اپنی طاقت کے آخری نفس تک جنگ کرتے رہے اور سب سے آخر میں امید کے تمام رشتے منقطع ہوجانے کے بعد بادل ناخواستہ اسلام لائے تھے انہیں ان انقلابات میں اپنے منصوبوں کے پورا کرنے کا اچھا موقع ملا۔

حضرت خلیفہ ثانی (عمر بن الخطاب) ہی کے دور میں شام پر ان کا تسلط ہو گیا تھا جو صرف گورنری کی حیثیت سے تھا لیکن قدم جمانے کیلئے بہت کافی تھا۔

تیسرے دور میں خوش قسمتی سے مرکزی حکومت یعنی خلافت کا سہرا بھی بنی امیہ کے سر پر بندھا اور اس گروہ کو اسلام کے ساتھ اپنے دیرینہ منصوبوں کے پورا کرنے کا پورا موقع مل گیا۔

حضرت خلیفہ ثالث کے ساتھ حسن ظن کو راہ دیتے ہوئے یہ کہا جا سکتا کہ صاف وسادہ لوح خلیفہ وقت کو اپنے خاندانی افراد کے اغراض ومقاصد اور ان کے اطوار وحالات کی اطلاع نہ تھی، لیکن یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اس عہد میں صحابہ رسولؐ اور سچے اسلامی فرزندوں کے ساتھ انتہائی شرمناک برتاؤ اختیار کئے گئے اور اپنوں کی جانبداری اور ان کے بدترین مظالم کی حمایت انتہا تک پہنچ گئی جس کے بعد پانی سر سے اونچا ہو گیا اور مظالم کو برداشت کرتے کرتے صبر کے پیمانے لبریز ہو گئے جس کا افسوس ناک نتیجہ قتل خلیفہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔

تاریخ کے مطالعہ سے اس قتل کی بہت کچھ ذمہ داری بنی امیہ کے سر دکھائی دیتی ہے۔ اس کے بعد کے حالات نے پلٹا کھایا اور خلافت کے لئے بڑے بڑے صحابہ کرام اور اہل حل وعقد کے اتفاق آراء سے حضرت علیؑ کا انتخاب ہوا اور سب نے باتفاق آپ کی بیعت کی لیکن شام کے گورنر معاویہ بن ابی سفیان جو وہاں پورے طور پر قبضہ جما چکے تھے وہ اسلامی متفقہ فیصلے کے سامنے سرنگوں نہ ہونا تھے نہ ہوئے اور خونِ حضرت عثمان کی طلب کے بہانے سے علیؑ بن ابی طالبؑ سے برسرِ پیکار ہوئے، چنانچہ جنگ صفین کے سیکڑوں معرکے جن میں ہزاروں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہہ گیا اسی کا کرشمہ تھے۔

آخر اس جنگ کا فیصلہ ایک مکارانہ مصالحت کے ساتھ ہوا جس میں اگر دیانت و امانت کا جوہر کارفرما ہوتا تو یقیناً مسلمانوں کے درمیان سے ناگوار اختلاف کا خاتمہ ہوسکتا تھا لیکن افسوس کہ حرص و آز کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے اس ظاہری مصالحت کو فتنہ و فساد کا پیش خیمہ قرار دے دیا اور اختلاف و افتراق کی خلیج پہلے سے زیادہ وسیع ہوگئی۔

یہ وہ وقت تھا کہ شام کے تخت پر بنی امیہ کے قدم پوری طاقت کے ساتھ جم گئے تھے۔ ادھر امیر المومنین علیؑ کو مسجد کوفہ میں شہید کیا گیا ادھر شام میں مخالفت اہلبیتؑ کا طوفان پوری قوت پر بلند ہوگیا اور دمشق بلکہ تمام بلاد اسلامیہ کے منبروں پر کمال جرأت کے ساتھ اہل بیت رسولؐ پر لعن وطعن کا بازار گرم ہوگیا۔

اس زمانہ کے بعض اہم خصوصیات

امیر معاویہ اگرچہ صحابۂ رسولؐ کی ایک ممتاز فرد سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کے دور حکومت کے یہ افسوس ناک خصوصیات ہیں جو اسلامی تاریخ میں جلی حرفوں سے مرقوم نظر آتے ہیں اور ان سے اس زمانہ میں اسلام کے ضعف و کسمپرسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۱) وضع احادیث اور خدا و رسولؐ پر افترا اور بہتان کوئی جرم نہ رہا بلکہ اس پر مخصوص مصالح کے تحت میں جائزہ و انعام دیا جاتا تھا چنانچہ ابوالحسن علی بن محمد مدائنی جو اسلامی مورخین میں بڑے پایہ کا شخص ہے اس نے کتاب الاحداث میں اس زمانہ کے حالات درج کرتے ہوئے لکھا ہے:

كتب معاوية الى عمّاله فى جميع الآفاق ان لا يجيز والاحد من شيعة على شهادته وكتب اليهم ان انظروا من قبلكم من شيعة عثمان و محبيه واهل ولايته الذين يروون فضائله و مناقبه فادنوا مجالسهم وقربوهم واكرموهم واكتبوا اليّ بكل مايروى كل رجل منهم واسمه واسم ابيه وعشيرته ففعلوا اذلك حتى اكثروا فى فضائل عثمان و مناقبه لماكان يبعثه اليهم معاوية من الصّلات والكسآء والحبآء والقطائع ويفيضه فى العرب منهم والموالى فكثر ذلك فى كل مصر وتنافسوا فى المنازل والدنيا فليس يجد امرؤ من الناس عاملا من عمال معاوية فيروى فى عثمان فضيلة او منقبة الا كتب اسمه و قربه و شفعه فلبثوا ابذلك حينا۔

''معاویہ نے تمام عمال کو لکھا کہ جو شخص حضرت عثمان کی فضیلت میں کسی حدیث کو بیان کرے اس کا پورا نام مع مرتبہ کے میرے پاس لکھ کر بھیج دو اور پوری طرح جائزہ و انعام سے اس کو مالا مال کردو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فضیلت عثمان میں احادیث کثرت سے ہوگئے اور ایک مدت تک یہ سلسلہ قائم رہا۔

ثم كتب الى عمّاله ان الحديث فى عثمان قد كثر و فشا فى كلّ مصر و كلّ وجه و ناحية فاذا جاء كم كتابى هذا فادعوا الناس الىٰ الرّواية فى فضائل الصحابة والخلفاء الاوّلين ولا تتركوا خبرا يرويه احد من المسلمين فى ابى تراب الا و أتونى بمناقض له فى الصحابة فان هذا احبّ اليّ و اقرّ لعينى و ادحض لحجة ابى تراب و شيعة و اشد عليهم من مناقب عثمان و فضله فقرأت كتبه على الناس فرويت احاديث كثيرة فى مناقب الصحابة مفتعلة لا حقيقة لها و جدّ الناس فى رواية مايجرى هذا المجرى حتىٰ اشادوا بذكر ذلك على المنابر والقى الى معلّمى الكتاب فعلّموا صبيانهم من ذلك الكثير الواسع حتىٰ رووه وتعلّموه كما يتعلمون القرأن وحتىٰ علموه بناتهم ونسائهم وخدمهم وحشمهم فلبثوا ابذلك ماشآء الله۔

''پھر تمام گورنروں کو لکھا گیا کہ عثمان کی فضیلت میں احادیث کا بہت کافی ذخیرہ جمع ہوگیا ہے اب تم دیگر صحابہ کے فضائل میں روایت احادیث کی طرف لوگوں کو دعوت دو اور جو کوئی فضیلت بھی ابوتراب کی نسبت احادیث میں وارد ہوئی ہے اس کے مقابل دوسرے صحابہ کے لئے بھی بیان کرو۔ علیؑ اور ان کے شیعوں کی دلیل کے باطل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے، بس پھر کیا تھا، فرمان لوگوں کے سامنے پڑھا گیا اور سیکڑوں حدیثیں صحابۂ کبار کے مناقب میں تصنیف ہوگئیں جن کی کچھ اصلیت نہ تھی۔ واعظین ان کو منبروں پر پڑھتے اور معلمین مکتب

بچوں کو قرآن کی طرح حفظ کراتے تھے بلکہ لڑکیوں عورتوں اور غلاموں کنیزوں تک کو یاد کرانا ضروری سمجھتے تھے۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سچے اسلامی روایات بھی ان بے حقیقت اخبار کے ساتھ مخلوط ہو کر بے اعتبار بن گئے اور علمی تحقیق و تدقیق میں ایک بہت بڑا رخنہ پڑ گیا۔

(۲) سب و شتم اور اکابر اہل اسلام کو گالیاں دینے کا دستور نکل آیا، دمشق و شام کے منبروں پر چالیس برس تک یہ رسم ادا ہوتی رہی اور علیؑ بن ابی طالب کی نسبت اس جسارت کا سلسلہ قائم رہا۔

(۳) بلاد اسلامیہ میں شراب بہت آزادی کے ساتھ استعمال کی جانے لگی اور اس کی خرید و فروخت میں کوئی روک ٹوک باقی نہیں رہی چنانچہ عبدالرحمن بن سہل انصاری (صحابی رسولؐ) نے شراب کے بار سے لدے ہوئے اونٹوں کو دیکھا تو اپنے نیزہ کی نوک سے ان مشکوں کو پھاڑ ڈالا حضرت معاویہ کو خبر معلوم ہوئی تو کہا اس بڈھے کو چھوڑ دو اس کی عقل جاتی رہی ہے عبدالرحمن نے سنا تو کہا خدا کی قسم میری عقل نہیں گئی ہے مگر رسالتمآبؐ نے ممانعت فرمائی ہے اس سے کہ شراب ہمارے شکم میں داخل ہو یا برتنوں میں رکھی جائے۔

(دیکھو کتاب اسدالغابہ ابن اثیر جزری ج ۳ ص ۲۹۹ و اصابہ حافظ ابن حجر عسقلانی ج ۲ ص ۴۰۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شراب کی درآمد مسلمانوں میں بہت خوبی سے ہو گئی تھی اور اگر کوئی سچا مسلمان تعرض کرتا تھا تو اسے دیوانہ اور بے عقل کا خطاب دیا جاتا تھا۔

(۴) بے گناہ مسلمانوں کا خون بہت بے دردی سے بہایا جانے لگا، سیکڑوں کلمہ گویوں کی گردنیں زیر تیغ ہو گئیں۔ سمرۃ بن جندب اور بسر بن ارطاۃ اور زیاد بن ابیہ کی سیاہ کاریاں اسی عہد کا نامۂ عمل ہیں۔ عبداللہ بن عباس کے دو کمسن بچے ماں کی گود میں ذبح کر دئے گئے جس سے وہ مجنوں ہو گئیں۔

(ملاحظہ ہو استیعاب ابن عبدالبر مطبوعۂ دائرۃ المعارف حیدر آباد جلد اول ص ۶۶)

(۵) مذہب کا وقار بالکل کم ہو رہا تھا اور بڑے سے بڑے ارکان مذہبی کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔

امیر معاویہ نے بڑے فخر سے جاریہ بن قدامہ اور احنف دو شخصوں کی نسبت فرمایا کہ **اشتریت منهما دینهما** 'میں نے ان سے ان کا مذہب مول لے لیا ہے' استیعاب ج ۱ ص ۱۵۴

مصر کے لوگوں نے دربار میں آکر **السلام علیک یارسول اللہ** کہا اور اس کو گوارا کر لیا گیا سزا دینا تو بڑی بات تھی معمولی سی زبانی تنبیہ بھی نہ کی گئی

(ملاحظہ ہو تاریخ طبری ج ۶ ص ۱۸۴)

ان دونوں واقعوں کو ہم نے اپنے رسالہ "قاتلان حسین کا مذہب" میں تفصیل سے لکھا ہے اور ان سے اس وقت کے اسلامی احساسات و جذبات کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے۔

امیر معاویہ کا زمانہ کسی نہ کسی طرح بسر ہو گیا اور انہوں نے اپنی عمر گزار دی مگر مسلمانوں کے سر پر ظلم و ستم کے ایسے دیوتا کو سوار کر گئے جس نے اسلام کے شیرازہ کو بالکل درہم برہم کر دیا۔ یزید کے اخلاق و عادات سے امیر معاویہ بے خبر تھے؟ نہیں ہرگز نہیں، وہ خود یزید کے خصوصیات سے واقف تھے اور اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر مکی اپنی کتاب "**تطهیر اللسان والجنان**" میں جو حضرت معاویہ کے مناقب و فضائل میں تصنیف کی گئی ہے لکھتے ہیں کہ ایک روز امیر معاویہ رونے لگے، مروان نے کہا کہ کیوں کیا ہوا؟ آپ کے رونے کا سبب؟ جواب دیا کہ

ای شئ کنت عنه عزوبا کبرت سنیٔ ورق عظمی وکثرت الدموع فی عینی ورمیت فی احسن مایبدو منی ولولا هوای فی یزید ابصرت قصدی"

"دنیا میں کون راحت تھی جو میں نے نہ اٹھائی ہو، اب سن زیادہ ہو گیا، ہڈیاں گھل گئیں، جسم کمزور ہو گیا لیکن اگر مجھ پر یزید کی محبت کا غلبہ نہ ہوتا تو میں اپنے لئے راہ راست کو حاصل کر لیتا"

(حاشیہ صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص ۵۶)

علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

قوله ولولا هوای الخ فیه غایة التسجیل علی نفسه

بان مزید محبته لیزید اعمت علیه طریق الهدیٰ واوقعت الناس بعده مع ذلک الفاسق المارق فی الرّدیٰ۔

''ان الفاظ میں معاویہ نے پورے طور پر اقرار کرلیا ہے کہ یزید کی محبت نے ان کو ہدایت کے راستوں سے اندھا بنادیا ہے اور اسی فرط محبت نے مسلمانوں کو ان کے بعد ایسے فاسق وفاجر کے ہاتھوں میں مبتلا کردیا جوان کی ہلاکت کا باعث ہوا''

(حاشیہ صواعق محرقہ ص ۵۸)

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ امیر معاویہ یزید کے افعال وعادات سے بے خبر تھے اور اس کی ولی عہدی نیک نیتی پر مبنی تھی، یزید کی بیعت مسلمانوں سے زبردستی لی گئی اور زروجواہر کے خزانے اس کے لئے وقف کردئے گئے۔ یزید تخت خلافت پر متمکن ہوا اور اس کے فسق وفجور نے دنیا کو پرکردیا۔ ہر طرف معصیت خدا اور مخالفت شریعت کا بازار گرم ہوا، مذہب بازیچۂ اطفال اور اسلام زینتِ طاقِ نسیاں بن گیا۔ یزید کے افعال وعادات کے تفصیلی تذکرہ سے ان صفحات کو پر نہیں کیا جاسکتا، اسلام کی مستند تاریخیں ان واقعات کو اپنے اندر محفوظ کئے ہوئے ہیں۔ واقدی نے مختصر الفاظ میں جس طرح یزید کی بدکرداری کی تصویریں کھینچی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

کان رجلاینکح امهات الا ولاد والبنات والاخوات ویشرب الخمرویدع الصّلوٰة۔

''وہ ایسا شخص تھا کہ اپنے باپ کی منکوحہ کنیزوں اور اپنی بہنوں بیٹیوں تک کو نہ چھوڑتا تھا، شراب پیتا تھا اور نماز کو ترک کرتا تھا''

(ملاحظہ ہو: صواعق محرقہ، علامہ ابن حجر مکی ص ۱۳۵)

اب بتاؤ کہ کیا اسلامی بادشاہ یا خلیفۃ المسلمین اور مجوسیوں میں کچھ بھی فرق ہوا؟ حد سے زیادہ فاسق اشخاص بھی اپنی ماں بہنوں بیٹیوں سے مقاربت کرنا حمیت وغیرت بلکہ انسانیت کے خلاف سمجھتے ہیں۔

بادشاہ وقت کی ان عادات واخلاق کو دیکھ کر دنیا نے رنگ پکڑلیا تھا اور مذہبیت بالکل فنا ہوگئی تھی۔ لطف یہ ہے بڑے بڑے صحابہ سر تسلیم خم کئے ہوئے تھے اور کسی کے دہن سے صدائے اعتراض بھی بلند نہ ہوتی تھی۔ سوائے پانچ شخصوں کے تمام صحابہ وتابعین یزید کو خلیفۂ رسولؐ تسلیم کرچکے تھے۔ ان پانچ میں سب سے پہلا نام حسینؑ بن علیؑ کا ہے اور آپ کی دیکھا دیکھی عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمن بن ابی بکر اور عبداللہ بن عباس۔ یزید کی طرف سے کوشش شروع ہوئی کہ ان کو بھی پابند بنایا جائے اور سب سے زیادہ امام حسین علیہ السلام کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونے کے لئے اہتمام کیا گیا۔

گذشتہ تاریخ اور اسلام کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ علیؑ بن ابی طالب کا فرزند اور خاندان رسولؐ کا سب سے بزرگ شخص اگر ان حالات کی موجودگی میں یزید کی بیعت کرلیتا تو اسلام کا نام بھی باقی نہ رہ سکتا۔

حسن مجتبیٰؑ کی صلح مجاہدہ کربلا کی تمہید تھی

ہر اقدام جو اپنے وقت پر ہو وہ مفید نتیجہ خیز اور مؤثر ہوتا ہے لیکن اگر وقت سے پہلے کیا جائے تو وہ نتیجۂ مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتا ہے بلکہ اپنے کرنے والے کو اکثر ہمیشہ کے لئے مورد الزام بنادیتا ہے۔

واقعات کی رفتار یکساں نہیں رہتی بلکہ تدریجی حیثیت سے ترقی کرتی ہے اور ان کا طریقۂ علاج بھی اسی اعتبار سے مختلف ہوجاتا ہے۔ عالم کا نظام اسی پر قرار پایا ہے اور انسان کی افتادِ طبع یوں ہی واقع ہوئی ہے اس میں تغیر وتبدل کا امکان نہیں۔

زخم رسیدہ پکے ہوئے جزوبدن ہاتھ یا پیر کا علاج کرو، پھاہے لگاؤ، مرہم بدلو، ضرورت ہوتو بار بار نشتر دلواؤ، پھر اگر نہ اچھا ہوا اور اس کی سمیت کے جسم میں سرایت کرنے کا خوف ہوتو اسے کاٹ کر بھی پھینک دو۔ کسی کو اعتراض کا حق نہ ہوگا لیکن اگر زخم پیدا ہونے کے ساتھ ہی یا کوئی علاج معالجہ کرنے کے پہلے ہی کاٹ ڈالتے تو ضرور مورد الزام اور عام طور پر بے عقل سمجھے جاتے حالانکہ یہ طرز عمل وہی تھا جو بعد میں اختیار کئے جانے

پرممدوح و مستحسن سمجھا جارہا تھا۔ دشوارگزارحالات کی اصلاح کے لئے قربانی اوروہ بھی جان کی قربانی کامیاب اورموثر ترین حربہ ہےلیکن سب سے آخری، جب تمام وسائل وذرائع ختم ہوجائیں اورکوئی تدبیر کارگر نہ ہواس وقت اس کا درجہ ہے۔ وہ جہاں تک آخری رہے وہیں تک ممدوح ہے اور اگراس سے پہلے عمل میں آگئی تواس پرجلد بازی، غیرموقع شناسی اورناعاقبت اندیشی وغیرہ کا الزام آجانا ضروری ہے جس کے بعد اس کوحق بجانب نہیں سمجھا جاسکتااوراسی کے ساتھ اس کی کامیابی اورتاثیر رخصت۔

حالات کی اصلاح کے لئے احتجاج واستغاثہ، مصالحت ورواداری، شرط وشروط اور قرارداداورمعاہدہ، یہ ایسی چیزیں ہیں جن کااختیارکیاجانا ابتدائی حدود میں ضروری ہے۔

بے شک جب یہ سب وسائل وذرائع اختیار کئے جانے کے بعد ناکام ثابت ہوں تو پھر من جرب الھجر رحلت به الندامة ''آزموده راآزمودن جہل است'' کےمطابق انسان سے ان ذرائع کا مطالبہ نہ ہوسکے گااوراس کی رفتارعمل کو آگے بڑھ کرکسی دوسرے اقدام تک پہنچنے کاحق پیدا ہوگا۔

یہی تدریجی رفتار اقدام عمل میں جب تک قائم ہے کامیابی کی توقع ہے ورنہ نہیں۔ ایک بات ہوجانے پر پہلے ہی دن مرنے مارنے پرآمادہ ہوجانے والا مغلوب الغضب کہا جائے گا۔ وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں برخلاف اس کے اگر تمام دیگرذرائع واسباب کے ذریعہ سے اتمام حجت کے بعدانسان کسی اہم مقصد کے لئے جان دینے پرتیار ہوجائے توفداکاری وجاں نثاری اور موثرقربانی قرار پائے گی۔

ایک انسان اگراپنے افعال واعمال میں توازن کوملحوظ رکھتا اوراپنی کارگزاریوں میں صرف جذبات کافرماں بردارنہیں بلکہ عقلی غوروتدبرکاپابند ہےتواسے اس نظام کاپابند ہوناضروری ہے۔

شام کی اموی سلطنت کے ہاتھوں بے شک مذہب خطرہ میں تھااورحق وصداقت پامال ہورہے تھے جس کی اصلاح کے لئے قربانی درکارتھی لیکن اس قربانی کےحق بجانب قرار پانے کے لئے دوسرے پرامن اورصلح پروروسائل وذرائع کےصرف کئے جانے کی ضرورت تھی۔

بیشک اگرامام حسینؑ ایکا ایکا بغیرکسی قسم کے سابقہ حالات کے یزید کی بیعت سے کنارہ کشی کرکے باوجودفقدان اعوان وانصارمخالفت پر، جس کا لازمی نتیجہ آپ کا قتل ہونا تھا تیار ہوجاتے اورایسا کرتے توان سوالوں کا پیدا ہونا ناگزیرتھا کہ آخر امامؑ نے اتحادعمل کے ساتھ حالات کے درستی کی کوشش کیوں نہ کی؟مخصوص شرائط کے ساتھ صلح کرکے اپنے مقاصد کوکیوں نہ حاصل کیا؟ کم سے کم امورسلطنت سے بےتعلقی اختیار کرکے مدینۂ رسول میں قیام پذیرکیوں نہ رہےاورکربلا آکراپنےتئیں معرض خطر میں کس لئے ڈالا؟

یہ سوالات پیدا ہونے کے بعدجن کا کوئی صحیح حل بھی موجود نہ تھا یقینا آپ کاقتل ہوناصرف جذبات کی کارفرمائی کانتیجہ قرار پاتااور اس لئے نہ قابل ستائش ہوتااورنہ موثروکامیاب،لیکن واقعہ یہ تھا کہ امام حسینؑ کااقدام عمل یا قربانی وہ ایک مکمل نظام کے تحت میں واقع ہوا تھا جس کے لئے برسوں کی طویل مدت کے حالات موقع کو قریب لارہے تھے یہاں تک کہ ۶۱ھ میں اس کاوقت آگیا۔

شروع شروع میں امام حسنؑ کا صلح کرلینا اورمخصوص شرائط معاہدہ کےساتھ سلطنت کی ذمہ داریوں سے دستکش ہوکردس برس خاموشی کی زندگی بسرکرنا،اورپھردس ہی برس تک خودامام حسینؑ کا بھی عملی حیثیت سے خاموش رہ کرحالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اکثرزبانی یامکتوبی احتجاج کرتے رہنا،لیکن باوجوداس کےحالات کا رو بہ اصلاح ہونے کے بدلے بدسے بدتر ہوتے جانا،شرائط معاہدہ کاٹھکرادیا جانا،صلح نامہ کے دفعات کا پامال ہوجانا، زبانی احتجاج واستغاثہ پرکوئی شنوائی نہ ہونا بلکہ اپنے انسانیت سوزاور اسلام کش افعال پربیش ازبیش اصرارکیا جانااوراس سلسلہ میں پانی کا سرسےاونچاہوجانااورمعاملات کاحدسےگزرجاناوہ تھاجس نے امام حسینؑ کے لئے اس عظیم اقدام کا موقع پیدا کردیا تھا کہ جوانہوں نے کربلا کی سرزمین پرانجام دیا۔

یہ اعتراض تاریخی حالات سے بے خبری کا نتیجہ ہوگا کہ امام حسینؑ نے خود اپنی جان کو معرض خطر میں ڈالا۔ اگر وہ مدینہ میں قیام کرتے اور یزید سے برسرپرخاش نہ ہوتے تو آپ کا خون کربلا کی زمین پر نہ بہتا۔

یہ خیال بالکل بے حقیقت ہے۔ بنی امیہ کی عداوت بنی ہاشم اور خصوصاً علیؑ بن ابی طالب کی اولاد سے اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ وہ کسی طرح ان کو چین سے بیٹھنے نہیں دے سکتے تھے اور ان کی خاموش ہستی بھی ان کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتی تھی۔ حسن مجتبیٰؑ نے باجود صلح جوئی اور خاموشی و کنارہ کشی کے کیا پھل پایا؟ یہ کہ زہر قاتل کے اثر سے کلیجہ کے ٹکڑے ہوئے اور دشمنوں کی ظلم و بیداد کا خاموش افسانہ سناتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔ جناب خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی اپنی کتاب یزیدنامہ ص ۸۳ میں لکھتے ہیں:۔

''پہلا خون سیدنا حضرت امام حسنؑ کا ہے جو تاریخ کی روایت سے قطعاً امیر معاویہ کے اوپر ثابت ہے اور کوئی قدیم وجدید محاکمہ تاریخی وقانونی ان کی بریت اس قتل سے نہیں کرسکتا۔''

کون کہہ سکتا ہے کہ اگر حضرت امام حسینؑ عراق میں نہ آتے اور مدینہ میں قیام فرماتے تو ان کے قتل کے لئے کوئی ایسا ہی خاموش حربہ استعمال نہ کردیا جاتا جس طرح حضرت امام حسنؑ پر استعمال کیا گیا۔

اس وقت آپ کی جان بھی جاتی اور افراد بشر کے سامنے حقیقت کے واضح ہونے کا بھی کوئی طریقہ نہ ہوتا بلکہ جس طرح اس سے پہلے امام حسنؑ کی شہادت سے انکار کیا جاتا رہا اسی طرح حضرت کی شہادت سے بھی انکار کرنا ضروری خیال کیا جاتا، اور یہ یقینا یزید کی فتح اور حسینؑ کی شکست قرار پاسکتی تھی، کیوں کہ اس حالت میں اول الذکر نے اپنے مقصد کو حاصل کیا، حسینؑ کے وجود کو دنیا سے محو کردیا اور پھر عالم کے سامنے اپنے تئیں بری بھی ثابت کردیا اور حسینؑ نے اپنی جان سے ہاتھ دھویا اور کوئی نتیجہ خیز اثر بھی دنیا میں نہ چھوڑا، بھلا حسینؑ سے محیر العقول تدبر واستقلال کی مالک ہستی سے کب توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس پہلو پر متوجہ نہ ہو۔ حسینؑ نے اپنے معاملہ کو دو مختلف صورتوں میں منحصر پایا: ایک یہ کہ خاموش طریقہ پر اپنی جان سے ہاتھ دھوئیں اور دین اسلام و شریعت نبویہ بھی یزید کے افعال واقوال سے محو ہوکر رہے، دوسرے یہ کہ اپنی ہستی کو ظاہری صورت میں دست فنا کے سپرد کر کے ہمیشہ کے واسطے اپنی اور اپنے نانا کی تحریک کو زندہ کر کے اسلام کا ایک پائدار نقش چھوڑ دیں، فرزند رسولؐ نے اپنے عظیم تدبر و عاقبت اندیشی سے کام لے کر دوسری صورت کو ترجیح دی اور اسلام کو زندہ کرنے کے ساتھ اپنی موت کو اپنے اور اسلام دونوں کی فنا کے مقابلہ میں اختیار کیا۔

حسینؑ نے اپنی جان دے کر اپنے مخالفین کے مفاد کو ہمیشہ کے لئے پامال کردیا، اور یہی وہ عظیم فتح ہے جس کو حضرت نے ظاہری صورت میں فنا ہو کر حاصل کیا۔

حسینؑ کا اقدام عمل خالص تبلیغی شان رکھتا تھا

اور تدبر و سیاست کا بہترین نمونہ تھا

امام حسینؑ درحقیقت مدینہ سے اس بات کا بیڑا اٹھا کر نکلے تھے کہ دنیا کے سامنے حق کو حق اور باطل کو باطل ظاہر کردیں ۔چنانچہ انہوں نے اپنے مقصد کی اشاعت اور یزید کے ننگ انسانیت افعال کو طشت از بام کرنے میں وہ تمام وسائل وذرائع اختیار کئے جو ان کے عظیم تدبر و سیاست کا پتہ دیتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھو کہ حسینؑ نے مدینہ رسولؐ کو چھوڑنے کے بعد مکہ معظّمہ کو اپنے قیام کے لئے منتخب کیا۔ مکہ معظّمہ کا قیام سطحی نظروں میں تو اس غرض کے لئے تھا کہ اس مقام مقدس میں خوں ریزی حرام ہے لہذا ان کی زندگی دشمنوں کے خطرہ سے محفوظ رہے گی لیکن یہ نقطہ نظر ایسے شخص کے لئے تسلیم کیا جاسکتا ہے جس کو آخر تک اپنی جان بچانا منظور ہو مگر حسینؑ کو جو مرنے پر کمر باندھ چکے تھے اور پورے طور سے آخر تک ہونے والے واقعات پیش نظر رکھتے تھے جس کو برابر الفاظ میں بتلاتے بھی رہتے تھے ان کی

نسبت اس خیال کو کوئی وقعت نہیں دی جاسکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ مکہ معظّمہ قلب جزیرۃ العرب اور عالم اسلام کا مرکز تھا، اطراف وجوانب کے قافلے برابر آتے رہتے تھے اور علاوہ فریضۂ حج کے جو اسلامی شریعت کی رو سے ہر مستطیع مسلمان پر واجب ہے اور جس کی بدولت اشہر حج میں چاروں طرف سے مختلف قبائل عرب کا آنا ضروری ہے خود عرب کے قدیم روایات اور سابقہ عمل درآمد کی وجہ سے جو صدیوں سے قائم تھا اور اسلام نے بھی جس کو باطل کرنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی عرب کے اس خطہ کو تمام مختلف الخیال قبائل عرب کا محل اجتماع ہونا لازمی تھا، وہ مشہور کانفرنسیں جو شعر وسخن اور خرید وفروخت وغیرہ کے لئے قائم ہوتی تھی جن کو اسواق العرب کہا جاتا ہے ذی القعدہ سے لے کر محرم تک مکہ وطائف اور مدینہ کے درمیان ہی قائم ہوتی تھیں۔

امام حسینؑ کی شخصیت دنیائے عرب میں کوئی اجنبیت نہ رکھتی تھی، اگر چہ مذہبی احساسات مردہ ہوگئے ہوں اور حسینؑ کو ان کے واقعی مراتب کے ساتھ لوگ نہ پہچانتے ہوں لیکن رسولؐ کا نواسا، سلطان حجاز وعراق کا فرزند، ملک عرب کا سب سے زیادہ سخی وجواد، جس کے گھر سے کبھی کوئی سائل محروم نہیں پھرا، بنی ہاشم کا بزرگ خاندان، یہ عنوان وہ تھے جن سے کوئی بھی ناواقف نہ تھا اور کسی کو ان کے انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی۔

حسینؑ نے یہی زمانہ کہ جو تمام قبائل عرب کے اجتماع کا تھا مکہ میں اپنے قیام کے لئے تجویز کیا ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ حسینؑ اپنے لئے کوئی بڑا لشکر جمع کرنا چاہتے تھے اور ان قبائل عرب کے ساتھ روابط بڑھا کر اپنی حیثیت کو مضبوط بنا کر یزید سے مقابلہ کا خیال رکھتے تھے۔ نہیں، ہرگز نہیں، اگر وہ ایسا چاہتے تو کر سکتے تھے اور مضبوط تحریک ہونے کی صورت میں ممکن نہ تھا کہ اس میں کامیابی نہ ہوتی۔

یمن بالکل نزدیک تھا، جس کا اسلام علیؑ بن ابی طالب کا رہین منت تھا اور اس کی وجہ سے وہاں کے رہنے والوں کو علیؑ بن ابی طالبؑ اور ان کے گھرانے سے پوری ہمدردی حاصل تھی۔

طائف بھی کچھ اولا درسولؐ کا مخالف نہ تھا لیکن فرزند رسولؐ کو عالمگیری اور جہانبانی کا شوق نہ تھا، وہ اپنے تئیں ایک عظیم الشان بادشاہ تسلیم کرانے کی ہوس نہ رکھتے تھے، مگر حسینؑ کا قیام مکہ معظّمہ میں صرف اس لئے تھا کہ جمہور عرب کے اندر صورت حالات کی طرف ایک توجہ پیدا ہوجائے اور یزید کے افعال واعمال کا چرچا ہونے لگے۔

حسینؑ کے قتل کے لئے حجاج کے لباس میں شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے ہوں یا حضرت کے پابہ زنجیر کر لئے جانے کا سامان کیا گیا ہو بہر حال نامعلوم اسباب وعلل کے ماتحت امام کا بیت الحرام سے رخصت ہونا اور زمانہ حج کے گزرنے کا انتظار بھی نہ کرنا، اس کو امام کے تبلیغی مقصد میں پورا دخل ہے۔

ایکی ایکا خلاف توقع حسینؑ کا حج ترک کر دینا اور تمام اہل وعیال کے ساتھ مکہ معظّمہ سے نکل کھڑا ہونا ایسی حالت میں کہ حج کا زمانہ بہت کم باقی تھا اس نے تمام قبائل عرب کے نمائندوں میں ایک لہر دوڑا دی اور اگر کوئی تاریخ اس موقع کی قلم بند کی گئی ہوتی تو اس میں ضرور نظر آتا کہ اس موقع پر کن خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔

حسینؑ بن علیؑ کہاں چلے گئے؟ حج بھی نہ کیا؟ ان تمام اہل وعیال واقربا کے ساتھ اپنے نانا کی قبر کے جوار کو کیوں چھوڑ دیا؟ (یزید کے خوف سے) کیوں؟ یزید کیا چاہتا ہے؟ (حسینؑ سے بیعت کا طالب ہے) **لاحول ولا قوۃ! بھلا ایسا کیوں** کر ہوسکتا ہے؟ فرزند رسولؐ اور یزید ایسے شراب خوار اور زنا کار فاسق وفاجر کی بیعت کرے! اچھا پھر مکہ معظّمہ میں کیوں قیام نہ کیا؟ کس لئے حج کو بھی ترک کر دیا؟ جان کا خطرہ تھا، شاید مکہ میں حسینؑ کے قتل کرنے کے لئے شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے تھے۔ توبہ توبہ! اس سے بڑھ کر سفا کی وظلم کیا ہوگا کہ فرزند رسولؐ کو حرم میں بھی چین نہ لینے دیا جائے۔

یہ تذکرے وہ ہوں گے جو مکہ معظّمہ اور اس کے اطراف وجوانب میں اکثر باخبر حلقوں میں بہت اہمیت کے ساتھ جاری تھے۔

وہ زمانہ کہ جب طرق مراسلت ومخابرت مسدود تھے۔ تار ٹیلیفون وغیرہ خبر رسانی کے ذرائع نایاب، اس سے بڑھ کر کوئی طریقہ واقعات کی اشاعت کا نہیں ہوسکتا تھا۔ مکہ سے روزانہ لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ جو شخص تازہ اپنے شہر میں آیا اس کو بھی تازہ واقعات کی ضمن میں حسینؑ کے نقل وحرکت اور اس کے اسباب وعلل کا بیان کرنا ضروری تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نہیں تھا کہ امامؑ کے لئے کوئی بڑا لشکر جمع ہوجائے، لیکن مطلب صرف اتنا تھا کہ پہلے سے ان حالات کی اشاعت ہوجانے کے سبب حسینؑ کی شہادت عام طور سے نامعلوم اسباب وعلل کا نتیجہ قرار نہ پائے تاکہ اہل شام کو اپنے دل سے اس کے لئے مخصوص وجوہ تراشنے کا موقع مل جائے اور حسینؑ کی مظلومیت وحقانیت مخفی ہوجائے یقیناً اگر امامؑ کی طرف سے ان طرق نشر واشاعت کو عمل میں نہ لایا جاتا تو یزید کی طرف سے امامؑ کی شہادت کو طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ حسینؑ کا خون رائگاں چلا جاتا بایں معنی کہ آپ اپنی جان بھی ہاتھ سے کھوتے اور کوئی ہمدردی بھی افراد بشر کے قلوب میں چھوڑ کر نہ جاتے اور نہ وہ مقصود جو آپ کا تھا حاصل ہوتا مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ امام شہید ہوئے اور تمام دنیا نے اس بات کو تسلیم کرلیا کہ وہ ناحق قتل کئے گئے۔ شام کا حاکم اور اس کے دشمن انسانیت وزراء اور ساتھی کسی تہمت تراشنے کا موقع بھی نہ پاسکے۔ اسے خداوند عالم کی قوت قاہرہ کے بعد حسینؑ کے تدبر سے تعلق ہے اور وہ اسباب وعلل شہادت کے نشر واشاعت کا نتیجہ تھا حسینؑ نے اپنی نقل وحرکت کے وجوہ کو زندگی ہی سے عالم اسلام میں شائع کر کے دشمنوں کی زبانیں بند کردیں اور اپنی مظلومی کے سامنے دنیا کے سر تسلیم کو خم کرالیا، اور اس سے بڑھ کر حقانیت کی تبلیغ کیا ہوسکتی ہے؟۔

حسینؑ کا قافلہ خاموش مبلغ تھا

حج کا زمانہ تھا، عراق، یمن، طائف وغیرہ سب طرف سے قبائل مکہ میں آرہے تھے، ادھر امام حسینؑ اپنے اہل واقرباء، انصار و اصحاب کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ خیمۂ وخرگاہ تمام اسباب ساتھ لئے ایک بڑے قافلہ کی صورت میں مکہ سے جارہے تھے۔ عالم مسافرت میں زندگی گزارنے والے واقف ہیں کہ راستہ میں چار پانچ آدمیوں کا بھی قافلہ نظر آئے تو کھوج ہوتی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آتے ہیں؟ پھر کہاں امام حسینؑ کا شاندار قافلہ اور اصحاب واعوان کا مختصر لشکر، اس پر طرہ یہ کہ حج کو دو دن باقی رہے مکہ معظّمہ کی طرف سے آرہا ہو جبکہ دنیا مکہ معظّمہ کی طرف حج کے لئے متوجہ ہے! یہ وجوہ یقیناً جاذب نظر اور جالب توجہ تھے اور ایک اجنبی شخص کو یہ پوچھنا ضروری تھا کہ یہ کس کا لشکر ہے؟ کہاں جارہا ہے؟ اور حسینؑ کا نام معلوم ہونے پر وہی سوالات جو ہم نے اس کے قبل درج کئے ہیں۔ چنانچہ تاریخیں شاہد ہیں۔

فرزدق سے ملاقات امام سے یونہی اتفاقی طور پر ہوئی تھی اور عبداللہ بن مطیع وعمر بن عبدالرحمن مخزومی بھی راستہ میں خلاف توقع امام سے دوچار ہوگئے اور پھر جو گفتگو ہوئی وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ حسین بن علیؑ اور ہاشمی جوانوں کا شاندار قافلہ جو خانۂ خدا کو بمجبوری چھوڑ کر جنگلوں میں راہ پیما تھا خود ایک خاموش مبلغ اور داعی حق تھا جو دور کے لوگوں کو تحقیق حالات اور کشف حقائق پر مجبور کردیتا تھا۔

کربلا کی سرزمین پر تبلیغ

راستہ کے تمام اہم واقعات کو چھوڑتے ہوئے امام کی اس عظیم الشان تبلیغ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو کربلا کی سرزمین پر حسینؑ سے ظاہر ہوئی۔ وہ وقت کہ جب خون کے پیاسے دشمنوں نے چاروں طرف سے امام پر راستہ بند کردیا تھا اور تیس ہزار کے لشکر نے دین ومذہب بلکہ انسانیت وغیرت کو خیرباد کہہ کر فرزند رسولؐ کے قتل پر کمر باندھ لی تھی۔ ان کا گمراہی سے باز آنا ناممکن تھا اور حسینؑ اسباب سے واقف تھے لیکن ایک مبلغ مذہب اور داعی حق کا فریضہ ہے کہ وہ حق کی آواز کو بلند کردے اور تبلیغ ودعوت

میں کوتاہی نہ کرے اور اس فرض کو امامؑ نے خوب ادا کیا۔

ایک شب کی مہلت نماز کے لئے اور مفاد اسلام کی بے نظیر تبلیغ

۹ر محرم کو اس وقت کہ جب خونخوار لشکر کی یورش تھی اور حسینؑ اور ان کی مختصر جماعت کے قتل کے لئے حملہ کر دیا گیا تھا، حسینؑ نے اپنے بھائی کو بھیج کر ایک شب کی مہلت مانگی، کیوں؟ کیا اس لئے کہ حسینؑ اپنے اہل حرم سے رخصت ہو لیں، اپنے عزیزوں کو دل بھر کر ایک رات اور دیکھ لیں یا ایک شب میں کوئی سامان جنگ کر لیں؟ نہیں۔ بلکہ صرف اس لئے کہ آج کی رات پھر خدا کی عبادت کر لیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ شب اس طرح گزاری کہ **لهم دوی کدویّ النحل** ''اس جماعت کی آوازیں ذکر الٰہی اور تسبیح کے ساتھ اس طرح گونج رہی تھیں جیسے شہد کی مکھی کے چھتے سے آواز آتی ہے۔''

اس طرح انہوں نے دکھلا دیا کہ سخت ترین مواقع پر کس طرح اصول مذہب کا خیال رکھا جاتا ہے اور یہ کہ مذہبی جذبہ عالم کے ہر جذبہ سے زیادہ پر طاقت ہے۔

عاشور کے دن نماز ظہر

گذشتہ موقع سے سخت اور زیادہ کٹھن وہ موقع تھا جب لڑائی شروع ہو چکی تھی، حسینی مختصر لشکر کے بہت سے جوان قتل ہو چکے تھے۔ اور کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔ تیروں کی بارش تھی اور کمانوں کی کڑکنے کی گرج، لیکن اس حالت میں بھی نماز ظہر بجماعت ادا کی گئی اور ایسی نماز کہ جس کی نظیر عالم کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

امامؑ رو بقبلہ، اور مجاہدین کی صفیں پیچھے، اور دو بہادر جوان امامؑ کے آگے سینہ سپر بنے ہوئے کہ جو تیر آئے وہ اپنے اوپر روکیں، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ نماز ختم ہوتے ہوتے ان دونوں بہادروں میں سے ایک سعید بن عبداللہ حنفیؓ زمین پر گر کر تڑپنے لگتے ہیں اور دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

یہ تھے حقانیت کے مظاہرات اور صداقت کے نمونے، جو اگر چہ اپنے وقت وقوع میں خاموشی کے ساتھ عمل میں آئے لیکن انہوں نے دنیا کو دعوت حق کی پرزور آواز سے مملو کر دیا اور افراد اسلام کے اسلامی احساسات کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا اور دوسری طرف یزید اور ہواخواہان یزید کے ظالمانہ افعال اور اسلام کش حرکات کا پردہ چاک کیا۔

تبلیغ حق کے دیگر مظاہرات

عاشورے کی صبح سے لے کر عصر تک کے واقعات اگر ہم لکھنا چاہیں تو یہ مضمون کافی نہیں ہو سکتا تاریخ شاہد ہے کہ حسینی فوج کا ہر جوان ایک مبلغ کی حیثیت رکھتا تھا۔ بریرؓ ہمدانی کا مباہلہ، حبیبؓ بن مظاہر کا مکالمہ، زہیرؓ بن قین کا خطبہ اور تمام انصار و اقرباؑء کے وہ رجز جن میں سے ہر ایک حسینی شہادت کے اسباب وعلل بیان کرنے میں ایک مبلغ کا حکم رکھتا تھا۔ اس کا اثر ظاہر ہو یا نہ ہو کیوں کہ ایک مبلغ کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ اس کی آواز پر لبیک کہنے والے زیادہ تعداد میں پیدا ہو جائیں بلکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ وہ سخت اور کٹھن موقعوں پر اور دشوار گزار منازل میں اپنے فریضہ کو ادا کر دے اور جو دعوت و اظہار کا حق ہے اس کو پورا کر سکے۔

حسینی فوج کے تمام جوان داد شجاعت دے کر رخصت ہو چکے، ہاشمی خاندان کے شیر بھی اپنے بزرگ کی حمایت میں کام آ گئے، صرف مظلوم حسینؑ باقی ہیں اور دشمنوں کا حلقہ ہے، دل پر مصائب کا ہجوم اور آنکھوں میں دنیا تاریک ہے مگر وہ مبلغ الٰہی، ربانی داعی مذہب اپنے فریضہ سے ایک سکینڈ کے لئے غافل نہیں ہے۔ وہ خطبے پڑھتا ہے، تقریریں کرتا ہے، صحابہؓ رسولؐ کو گواہ بنا کر اپنی حقیقت کا ثبوت دیتا ہے، کیا اس امید پر کہ یزیدی لشکر حسینؑ کی حالت پر رحم کھائے گا یا وہ درہم و دینار کی جلوہ آرائی اور اشرفیوں کی جھنکار اور حکومت و سلطنت کی طمع و حرص سے آزاد ہو کر حق کے راستہ پر آ جائے گا؟ لا واللہ! حسینؑ بھولے اور ناعاقبت اندیش نہ تھے، وہ خوب جانتے تھے مگر بنی نوع بشر کو حالات سے واقف اور باخبر بنانا چاہتے تھے، انہوں نے کوئی دقیقہ اظہار حق

میں اٹھانہیں رکھا اور آخری نفس تک اپنے فرض کو ادا کر گئے۔

اس وقت بھی جب شمر کا خنجر بوسہ گاہ مصطفیٰؐ کے قریب آچکا تھا اور امامت کا چراغ گل ہو رہا تھا حسینؑ نے اپنے قاتل کے سامنے تبلیغ کی اور اپنے نانا کی صداقت وحقانیت کو ثابت کر دکھایا "اے شمر ذرا اپنے چہرہ سے نقاب اٹھا" شمر نے نقاب ہٹائی، حضرت نے فرمایا صدق و اللہ جدّی "میرے نانا رسولؐ نے سچ کہا تھا کہ اے حسینؑ تیرا قاتل ایک مبروص (کوڑھی) شخص ہوگا"۔

روحی لک الفداء اے حسین بن علیؑ! آپ نے مرتے دم تک اپنے فریضہ سے ہاتھ نہیں اٹھایا، آپ نے اپنے نانا کے قول کی تصدیق زیر خنجر بھی ثابت کر دی۔ آپ کے خون کا ہر قطرہ جو کربلا کی زمین پر گر رہا تھا آپ کی مظلومیت کا مرثیہ خواں اور ملت اسلامیہ کا واحد مبلغ تھا۔

واقعۂ کربلا کے بعض روشن پہلو

ایثار و مواسات

مشترکہ ضرورت کے وقت دوسرے کو اپنے نفس پر مقدم کرنا ایثار ہے اور سخت موقع پر دوسرے کو مبتلا پا کر خود شریک مصیبت اور ہمدرد ہو جانے کا نام مواسات ہے۔

ان دونوں صفتوں کا بہتر اور مکمل ترین نمونہ زمین کربلا کے مجاہدین نے پیش کیا، ان میں سے ہر فرد نے امام کے نفس کی حفاظت کو اپنے نفس و بدن پر اس طرح مقدم سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنے تئیں جیتے جی معدوم سمجھ گئے تھے۔

سیدالشہداءؑ مصلّیٰ پر نماز ظہر ادا کر رہے ہیں اور دشمنوں کے تیروں کی بوچھار ہے۔ سعیدؓ بن عبداللہ اور زہیرؓ بن قین امامؑ کے سامنے سپر بنے ہوئے کھڑے ہیں اور ابھی نماز ختم نہیں ہوتی کہ سعید زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر جاتے ہیں۔

اور خود امامؑ نے مفاد ملی کی حفاظت کو اپنے نفس بلکہ نفس سے عزیز تر اولاد واقرباءؓ اور ان سے بھی بالاتر عزت و ناموس پر اس طرح مقدم کیا کہ خود دنیا کی ہر چیز سے ہاتھ دھولیا اور اپنے کو عالم بھر کے مصائب وآلام کا نشانہ بننا گوارہ کیا لیکن دین اسلام کو قائم کر گئے۔

اور مواسات کا یہ عالم کہ کوئی مصیبت انصار واصحابؓ پر نہیں پڑی جس میں امامؑ نے ان کا ساتھ نہ دیا ہو۔ انصار واعزاؑ کی شہادت کے عنوان مختلف تھے لیکن جب امام مظلومؑ کی شہادت پر ایک نظر کی جاتی ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک عنوان کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ ایک بیکس کے قتل کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ اس ایک ذات میں جمع ہو گئی تھیں۔

حسینؑ اس دن صرف اپنی جان نہیں دے رہے تھے بلکہ دنیا کو ایثار و مواسات کا نہ بھولنے کے قابل سبق دے رہے تھے اور بے نظیر مثال قائم کر رہے تھے۔

ثبات قدم واستقلال

سخت اور دشوار گزار مصائب کے باوجود قدم میں لغزش نہ ہونا ثبات واستقلال ہے اور اس امتحان میں کربلا کے مجاہدین کا نمبر سب سے اول ہے ان کے سخت اور دشوار گزار مصائب کی نوعیت عالم سے جداگانہ تھی۔ سروگردن کے باہمی ارتباط کا ایک مرتبہ دم شمشیر سے قطع ہو جانا ایک جانباز سپاہی کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن تین دن کی بے آبی اور زخموں کی کثرت کے سبب کلیجہ کے اندر آگ کا بھڑکنا ہر لحظہ احتضار ونزع روح کی تکلیف برداشت کرنے سے کم نہ تھا، کمسن بچوں کو ماہی بے آب کی طرح تڑپتے دیکھنا، اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی کے عزیز ترین سرمایہ اولاد کو کھنچی ہوئی تلواروں اور برستے ہوئے تیروں میں بھیجنا، نہیں، بلکہ اپنے ہاتھ پر جگر کے ٹکڑے کو نشانۂ تیر بنوا دینا ہر انسان کا کام نہیں۔ ان کے استقلال وثبات قدم کی نظیر تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے اور انہوں نے اس کے ذریعہ جو حیرت انگیز کامیابی حاصل کی اس کی مثال بھی ملنا ناممکن ہے۔ وہ فنا نہیں ہوئے بلکہ ہمیشہ کے لئے خود زندہ ہوئے اور ہزاروں کو زندہ کر گئے۔ دور فلک میں جب تک اسلام کا دور ہے ان کی یاد سچے مسلمانوں کے دل میں ہمیشہ تازہ رہے گی اور سرشک غم

کے سجۂ صددانہ پر ان کے نام کا ورد ہوتا رہے گا۔

عزت نفس اور موت کا موازنہ
مجاہد کربلا کا نعرہ شیرانہ

الموت اولیٰ من رکوب العار

زندگی عزیز شے ہے اور فطرت انسانی میں حیات دنیا کی محبت ودیعت کردی گئی ہے، انسان اسی کی خاطر سخت ترین دنیا کے مشکلات کو برداشت کرتا اور سرد وگرم عالم کا تحمل کرتا ہے۔ اس کی طبیعت اگر افراط بخل وغیرہ کے سبب حد اعتدال سے خارج نہیں ہوگئی ہے تو وہ اپنی جان کی حفاظت میں مالی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتا اور تمام ممکن ذرائع جن سے اس کی ہستی کی بقاء ممکن ہے ان کو صرف کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اسلام نے بھی اس فطری رجحان کو روکنے کی کوئی وجہ نہیں پائی بلکہ **لاتلقوا بایدیکم التھلکۃ** کے حکیمانہ حکم سے حفاظت نفس اور زندگی کی نگہداشت کو فریضۂ لازمہ قرار دیا لیکن فلک اعظم کے دور اور لیل ونہار کی آمدورفت میں ایسے نازک مواقع پیش آجایا کرتے ہیں جب جذبات نفسانیہ میں تلاطم اور طبعی وعقلی رجحانات میں تصادم ہوتا ہے۔ زندگی اپنی تمام دلفریبیوں کے باوجود اتنی مہیب صورت میں نظر آتی ہے کہ انسان بے اختیار اس سے آنکھ بند کرلینا پسند کرلیتا ہے اور وہ اسی محبوب زندگی سے جس پر وہ ہر شے کو قربان کرتا تھا ہاتھ دھونے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ یہ صورت کبھی غیر عقلی، شہوانی، جاہلانہ، ناعاقبت اندیشانہ رجحانات سے پیدا ہوتی ہے اور اس موقع پر جان دینے سے نہ عقل بڑھ کر مرحبا کہتی اور نہ شرع شاباش کی آواز دیتی ہے لیکن جس وقت موت سے بدتر زندگی یا زندگی سے بہتر موت میں معاملہ پڑگیا ہو جس وقت حیات دنیا اہم ترین مقاصد کے پامال ہونے کا پیش خیمہ ہو اور جس وقت عزت نفس اور فنائے ظاہری کا سوال درپیش ہو، جبکہ میزان عقل نے صورت حال کے مختلف پہلو پر غور کرکے موت کو حیات پر ترجیح دے دیدی ہو تو اس وقت موت کے منہ میں جاپڑنے والے دائمی حیات کے مالک ہوجاتے ہیں۔ عزت دار ہستیاں ہمیشہ عزت کا صدقہ جان کو سمجھتی ہیں۔ حسینؑ بن علیؑ نے کربلا میں جو راستہ اپنے لئے مقرر کرلیا تھا وہ اسی اصول پر مبنی تھا۔ ان کی زبان سے نکلی ہوئی لفظیں اگرچہ وسیع صحرائے کربلا میں گونج کر فنا ہوگئیں لیکن ان کا پائدار مفہوم اب بھی غیرت دار اقوام کے صحیفۂ حیات کا سرنامہ اور ان کے دیباچۂ زندگی کا عنوان اول ہے (**الموت اولیٰ من رکوب العار**) ننگ وعار کے برداشت کرنے سے موت کا آنا بہتر ہے'' ان کی یہ مختصر لفظیں علو ہمت کی منادی اور عزت نفس کی ترجمان ہیں اور انہی کو حسینؑ نے عملی صورت سے دنیا کو دکھلا دیا۔

اصول کی حمایت اور قربانی
حسینؑ کی قربانی دنیا سے نرالی تھی
اس قربانی کے انتظامات عجیب وغریب تھے

کربلا کے مجاہد حسین بن علیؑ کا اصول حق کی حمایت، شریعت اسلامیہ کی نگہداشت اور جابر وظالم طاقت کے مقابلہ میں روحانی ومذہبی خودداری کی حفاظت تھی۔ انہوں نے اپنے آخری نفس تک اس اصول کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا، وہ اگر پہلی ہی مرتبہ اپنی جان کی قربانی پیش کردیتے تو بہت ممکن تھا۔ اس قسم کی قربانیاں کم سہی لیکن بے مثال نہیں ہیں۔ سقراط نے بھی اپنے ہاتھ سے زہر کے جام کو اٹھا کر پی لیا تھا اور اپنی جان کو مقصد پر سے قربان کردیا تھا، لیکن حسینؑ بن علیؑ کا مقصد بہت اہم تھا، وہ اپنی قربانی کی نوعیت ہی عالم سے جداگانہ قرار دینا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اپنی طرف نسبت رکھنے والی ہر عزیز شے کو خود اپنے ہاتھ سے قربان کریں اور جب اپنے نفس کے سوا کچھ باقی نہ رہ جائے تو اس متاع گراں مایہ کو قربانی کے میدان میں پیش کردیں۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے راحت وآرام، وطن کی اطمینانی زندگی کو قربان کیا جس کے سلسلہ میں ان کو ہر طرح کی تکلیف برداشت کرنا پڑی۔

روز عاشور کی قربانیوں کے سلسلہ میں اپنے محبوب ترین اصحاب وانصار ساتھ کے کھیلے ہوئے احباب کو قربان کیا، عزیزوں کی باری آئی اور ایک ایک کرکے ان سب کو میدان قربانی میں

بھیجا، اپنے داہنے بازو وفادار بھائی قمر بنی ہاشمؑ کو قربان کیا، اپنے پیارے بھتیجے اور داماد قاسم بن الحسنؑ کو قربان کیا، اپنے دل کی قوت آنکھوں کی روشنی اور پیری کے سہارے علیؑ اکبر کو قربان کیا۔

باغ امید کی آخری کونپل اور غنچۂ ناشگفتہ علی اصغر کو خود اپنے ہاتھوں پر لا کر قربان کیا، ابھی تک دل کے ٹکڑوں کی قربانی ہو رہی تھی اب اعضائے بدن تک نوبت پہنچی، ان کو ایک ایک کر کے قربان کیا۔ گوشت و پوست، سینہ و دست، دل و جگر، چہرہ و جبین بلکہ سطح جسم کا چپہ چپہ اور اجزائے بدن کا ہر ذرہ قربان کیا، نوبت یہ پہنچی کہ تیروں کو جگہ نہ ملتی اور دشمنوں کی تلواروں، نیزوں کو جستجو کے بعد بھی خالی مکان نظر نہ آتا تھا، جب جسم کا ہر حصہ اور دل کا ہر ٹکڑا قربان ہو چکا، اصحاب و انصار اہل بیتؑ میں سے تو پہلے ہی کوئی باقی نہیں رہا تھا، اعضائے جسم کی قربانی کا بھی امکان نہ رہا، ایک نیزہ پر سیکڑوں نیزے اور ایک ایک تلوار پر سیکڑوں تلواریں پڑ چکیں اور تیر بھی اپنا پورا حوصلہ نکال چکے، اب حسینؑ کے لئے کوئی چارۂ کار نہ تھا، کوئی قربانی کے قابل شے باقی نہیں رہی تھی، صرف ایک رشتۂ حیات تھا جو روح و بدن کے اندر پوری کشش حیات کے باوجود قائم تھا اور ایک سر و گردن کا ارتباط تھا جس میں اب تک جدائی نہ ہوئی تھی۔

اس باہمت مظلوم کے لئے گذشتہ تمام قربانی کے مرحلوں کو طے کرنے کے بعد ایک قربانی کا مرحلہ بالکل آسان تھا، بلکہ اس میں خاص لذت محسوس ہو رہی تھی، عصر کے ہوتے ہوتے حسینؑ اس قربانی میں بھی کامیاب ہو گئے اور خنجر شمر سے کچھ دیر راز و نیاز کے بعد ایک طرف نفس کی آمد و شد کا سلسلہ اور نفس بدن کا ظاہری حلقۂ اتصال قطع ہوا اور دوسری طرف سر و گردن کے ارتباط میں جدائی پیدا ہوئی۔

آسمان لاکھوں برس گردش کرے، زمانہ کے ورق گوناگوں خصوصیتوں کے ساتھ سامنے آئیں اور الٹ جائیں لیکن اتنی شاندار، مکمل، منظم اور مرتب قربانی کی مثال پیدا نہیں ہو سکتی۔

حسینؑ کی شہادت کے بعد

فاطمہ زہراؑ کا چاند غروب ہو چکا ہے اور دشمن اپنے مقصد میں ظاہری صورتوں سے کامیاب ہو چکے ہیں، اب کوفہ و شام کے بازار ہیں اور بنی ہاشم کے گھرانے کی معزز خواتین، اور نیزوں پر کربلا میں شہید ہونے والے مظلوموں کے سر نصب ہیں۔ سطحی نظر سے دیکھنے والے اس منظر کو اہلبیت رسولؐ کے لئے سخت توہین وذلت کا باعث سمجھ رہے ہوں گے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت حسینؑ کی تبلیغ منتہائے شباب پر پہنچ گئی ہے اور دعوت حق کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا ہے۔ اگر چشم حقیقت بیں سے نظر کرو تو نیزہ پر سر حسینؑ جس کی پیشانی پر سجدۂ معبود کا نشان پڑا ہوا ہی **سیماهم فی وجوههم من اثر السجود** چہرہ سے نور ساطع ہے۔ ہونٹ تلاوت قرآن مجید میں مشغول ہیں **(ام حسبت ان اصحاب الکهف والرقیم کانوا من آیاتنا عجبا)**

دوسری طرف مخدرات عصمت، جوان نامحرموں کے مجمع میں چادر و مقنعہ سے محروم ہونے کے بعد غیرت و حیا کا مجسمہ، اخلاق محمدیہ کی تصویر، جاہ و جلال کی چادروں میں پنہاں، طہارت وعفت کے اندر ملبوس اور ان کے وہ حقائق و دقائق سے مملو خطبے **کانها تفرغ عن لسان ابیها** زینبؑ گویا علی بن ابی طالبؑ کی زبان کے ساتھ کلام کر رہی تھیں

یہ چیزیں وہ ہیں جنہوں نے صداقت کے پیکر میں روح پھونک دی، دنیا کی آنکھوں کے سامنے جہالت وضلالت کے پردوں کو چاک کر کے پھینک دیا، عالم کو شرق سے لے کر غرب تک حسینؑ بن علیؑ کا مرثیہ خواں اور یزید کے افعال واقوال سے بیزار و متنفر کر دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آج عالم کے گوشہ گوشہ اور دنیا کے ہر چپہ میں حسینؑ کا نام ہے، اور حجاز کا حقیقی بادشاہ کروڑوں افراد کے دلوں پر قیامت تک کے لئے حکومت کر رہا ہے اور بنی امیہ کے جبروت کا چراغ ہمیشہ کے لئے اس طرح گل ہوا کہ کوئی نام لینے والا بھی نہیں ہے۔ عالم نے دیکھ لیا کہ کون ظالم تھا اور کون مظلوم؟ ظلم کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور مظلومیت کی شان کیا ہے۔

(اشاعت اولی محرم الحرام ۱۳۵۳ھ امامیہ مشن لکھنؤ)